چونکہ مسیحی عقائد و مسلمات کے منافی ہے اس لئے وہ قابل سزا ہے۔" [1]

اس واقعہ سے ٹھیک پچاس سال بعد ۱۷۲۸ء میں تھامس دولسٹن کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے انجیل کی بعض آیات کی ایسی تشریح کی ہے جو سر تا سر ملحدانہ ہے۔ چنانچہ اس پر لارڈ ریمانڈ کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور فاضل جج نے ملزم کو مجرم گردانتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ چونکہ انگلستان کا قانون مسیحی قانون ہے اس لیے ملزم کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔ [2]

اس طرح ۱۷۴۵ء میں ایک یہودی کے خلاف اس بنا پر مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے تورات کی تعلیم کے لیے بارہ سو پونڈ وقف کر دیئے تھے! فاضل جج لارڈ ویک نے اپنے فیصلہ میں لکھا۔

"بارہ سو پونڈ کا وقف، مسیحی مذہب برداشت نہیں کر سکتا۔ اس وقف سے یہودیت کی اشاعت کی جائے گی اور چونکہ انگلستان کا قانون خدائی قانون ہے لہٰذا ملزم قابل سزا ہے۔" [3]

غرض ۱۶۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک قانون الحاد کے تحت جس قدر مقدمات عدالتوں میں دائر ہوئے ان سب میں فاضل ججوں نے دو باتوں کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا۔

(۱) انگلستان کا قانون مسیحی ارر خدائی قانون ہے اور اس کی خلاف ورزی مسیحیت سے انحراف کے مرادف ہے۔

(۲) ملزموں کی رائے عقیدہ، مسیحی تعلیم کے خلاف ہے لہٰذا وہ ملحد اور قابل سزا ہیں۔

عدالتوں کے فیصلے: سائنس اور علم کو چونکہ مظفر و منصور ہونا تھا اس لئے انگلستان کے مذہبی اور قانونی فیصلوں میں تغیر رونما ہوا اور مذہب نے شکست کھانے کے لئے تیاری شروع کر دی۔

۱۸۸۳ء میں تین اشخاص بریڈلا۔ فوٹ اور ریمزے کے خلاف اس الزام میں مقدمہ چلا گیا گیا کہ انہوں نے اخبار "فری تھنکر" میں چند ملحدانہ مضامین شائع کئے تھے مقدمہ کی سماعت کوئینز بنچ میں لارڈ چیف جسٹس کالرج (Coleridge) نے کی۔ لارڈ موصوف پر زمانہ کا اثر پڑ چکا تھا وہ سمجھتے تھے کہ کہ آزادی رائے پر قانون الحاد کے ماتحت مقدمات کی سماعت نہ صرف ان کی شان

---

[1] انچ بریڈ ابونر "Penalties Up0n Opinion" صفحہ ۳۱

[2] // // // // // صفحہ ۳۴

[3] // // // // // صفحہ ۳۵

کے خلاف ہے بلکہ کلیسا اور مسیحی نظام کے لئے روسیاہی کا موجب بھی ہے۔ آپ نے سرکاری وکیل کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ایک مسیحی مذہب کا منکر (مثلاً یہودی) عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر قانون الحاد کے ماتحت ملحدین کو سزا دے سکتا ہے حالانکہ سزا دینے والا خود مسیحیت کا منکر ہے! کیا قانون الحاد کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور تضحیک ہو سکتی ہے۔" [1]

آخر طول طویل بحث و تمحیص کے بعد فاضل جج نے تسلیم کیا کہ ملزمین قابل سزا ہیں اس لئے نہیں کہ انہوں نے ملحدانہ مضامین شائع کئے بلکہ اس لئے کہ ان کی اشاعت کا طریقہ غلط تھا! یعنی قانون الحاد کی زد میں طریقہ (Manner) آتا ہے۔ نفس مضمون (Matter) نہیں آتا!

۱۹۰۸ء میں ایک شخص ہنری بولٹر کے خلاف ہائی بری کورٹ میں ملحدانہ تقریر کرنے کے خلاف جسٹس فلی مور کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں تھامس ولیم اسٹوراٹ کے خلاف وکٹوریہ اسکوائر میں زندیقانہ تقریر کرنے کے الزام میں جسٹس ہورج کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اسی طرح ۱۹۱۲ء میں مسٹر اسٹیفسن کے خلاف کالج اسکوائر میں تقریر کرنے کے جرم میں استغاثہ دائر کیا گیا جس کی سماعت جسٹس ایلڈن ہنکس نے کی ان تین مشہور مقدمات میں فاضل ججوں نے ملزموں کے خلاف فیصلہ صادر کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"ایک شخص مذہب پر حملہ کرتے ہوئے بھی جرم الحاد کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ضروری نہیں کہ جو شخص مذہب کے بعض نظریات پر حملہ آور ہو وہ ملحد بھی ہو اور اس پر قانون الحاد کے ماتحت مقدمہ بھی چلایا جائے۔ جو شخص مذہبی معاملات میں آزادی کے ساتھ گفتگو کرنے کا مجاز و حقدار ہے۔ البتہ اسے اپنی حدود متعین کر لینی چاہئیں اور اسے اس مقام کو فراموش نہ کر دینا چاہئے جہاں وہ گفتگو کر رہا ہے اور نہ ان سامعین کو نظر انداز کرنا چاہئے جن کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا امکان ہے۔" [2]

غور فرمایئے کہ علم و حکمت سے مرعوبیت اور مذہب کی شکست کا یہ کتنا عبرتناک نظارہ ہے

---

[1] "Penalties Upon Opinion" صفحہ ۱۰۳

[2] "Penalties Up0n Opinion" صفحہ ۱۲۲

کہ انگلستان کی عدالتوں کے فاضل جج قانون الحاد کو شرمندگی اور ندامت کے ساتھ استعمال فرمارہے ہیں۔

(۱) ۱۶۷۶ء میں سر ہیل نے ۱۷۲۸ء و ۱۷۴۵ء میں تھامس وولسٹن اور لارڈ ہارویک نے اپنے فیصلوں میں لکھا کہ چونکہ ملزم کی رائے اور عقیدہ مسیحی تعلیم کے خلاف ہے لہٰذا وہ قابل سزا ہے۔

(۲) ۱۸۸۳ء میں جسٹس کالریج نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے پہلی بار انگلستان کو آگاہ کیا کہ قانون الحاد کے ماتحت ملزم کو سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ اس نے اظہار رائے کے لئے غلط طریقہ استعمال کیا تھا (اس لئے سزا نہیں دی گئی کہ اس کی رائے مذہب کے خلاف تھی۔)

(۳) ۱۹۰۸ء۔۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں جسٹس فلی مور جسٹس ہورج اور جسٹس ایلڈن بنکس نے یہ فیصلے صادر فرمائے کہ نہ تو مذہب کے خلاف کسی رائے کا اختیار کرنا جرم ہے اور نہ کسی خاص طریقہ سے اظہار رائے خلاف قانون ہے بلکہ اصل جرم یہ ہے کہ مقام اور ماحول کو نظر انداز کر دیا جائے!

گویا پہلے رائے اور خیال کو جرم قرار دیا گیا پھر آزادی رائے کو طریقہ کی طرف منتقل کیا گیا اور آخر میں طریقہ کو بھی مقام اور ماحول میں تبدیل کر دیا گیا! یہ سب کچھ علم و حکمت اور ضمیر کی آزادی کی خاطر ہوا اور اس طرح سائنس کو کامیابی اور فتح مندی حاصل ہوئی اور مسیحیت کو ہزیمت اور شکست اٹھانی پڑی!

نتائج: اگرچہ یہ بحث ابھی تشنۂ تکمیل ہے مگر اس حقیقت کی جانچ پڑتال کے لئے کافی ہے کہ مذہب اور سائنس میں معرکہ سے مراد مسیحیت اور سائنس کا تصادم ہے اسلام اور سائنس کی جنگ نہیں ہے کیونکہ

(۱) مسیحیت اور کلیسا نے ہی علوم و اکتشافات کا مقابلہ کیا اور انہیں کتب مقدسہ کے منافی قرار دیا۔

(۲) یورپ کے علماء اور محققین نے علم کے ہر شعبہ پر بحث کرتے ہوئے مسیحیت اور اس کے عقائد و رسوم پر ضرب لگائی اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ سائنس مسیحیت کے جہل اور کلیسا کے جمود کا ردعمل ہے۔

(۳) پوپ اور کلیسا اور محکمہ احتساب ہی نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں علماء و حکماء کو قتل کیا یا زندہ جلایا اور ہزاروں کی جانیں شکنجوں میں کس کر نکالیں۔

(۴) علم و دانش اور سائنس و انکشافات اپنی جگہ پر قائم رہے اور مسیحیت کو ان کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔ مسیحیت نے سائنس کے مقابلہ پر شکست کا اعتراف کیا اور اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے۔

(ا) سائنس اور مسیحیت میں کوئی معرکہ اور تصادم نہیں ہے حالانکہ سائنس آج بھی پکار کر اعلان کر رہی ہے کہ "مذہب" اور سائنس میں کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بقول اے۔ این وائٹ ہیڈ۔ یا تو مذہب کو سائنس کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے گی یا سائنس مذہب کے مقابلہ پر فنا ہو جائے گا (ب) رجال مذہب اور کتب مقدسہ کے حاملین نے سائنس کے ان ہی نظریات کو تسلیم کر لیا جن کی بنا پر یہ سارا طوفان کھڑا کیا گیا تھا۔ (ج) سائنس کی خاطر کتب مقدسہ میں تاویلیں کی گئیں اور سائنس کے خلاف جو باتیں نظر آئیں انہیں تمثیلی حقائق سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ تورات اور دیگر صحائف کی داستانیں افواہوں پر مبنی ہیں۔ تاریخی عنصر ان میں بہت کم ہے۔ متعدد صحائف کو جعلی اور بیشتر حصص کو الحاقی تسلیم کیا گیا۔

(۵) پوپوں، کلیساؤں اور محکمہ احتساب کی ظالمانہ اور جاہلانہ کارگزاریوں پر پردہ ڈالا گیا اور ندامت کے باعث حقائق کو چھپایا گیا ان میں تاویلیں کرنے کی کوشش کی گئی۔

(۶) عدالتوں کے ظالمانہ فیصلوں نے ہزاروں کو محبوس زنداں بنایا اور پھر سائنس کی خاطر فیصلوں اور دلیلوں کا رُخ پھیر دیا گیا۔

اب بتاؤ کہ مندرجہ بالا دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی اسلام کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے؟ ان امور میں سے کسی ایک امر کے لئے بھی اسلام اور مسلمانوں کو ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس خیال کی غلطی خود بخود آشکارا ہو جاتی ہے کہ مذہب اور سائنس کے معرکہ میں اسلام بھی شریک ہے! رہا یہ سوال کہ سائنس کے بہت سے نظریات اسلامی عقائد و حقائق کے خلاف ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ نہیں اگر سائنس نام ہے واقعات اور مشاہدات کا جو حق اور یقین پر مبنی ہو تو ایک مسئلہ کا نام لو جو اسلام کے کسی مسئلہ سے متصادم ہوتا ہو۔ قران کریم کتاب فطرت ہے اور سائنس اس کا عملی تجربہ اور ظاہر ہے کہ تجربات و مشاہدات کا تصادم فطرت کے حقائق سے نہیں ہو سکتا۔

دربار اکبری کا ملک الشعراء..... فیضی

(بقلم ڈاکٹر محمد امین عامر، جز وقتی لکچرر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج کلکتہ)

ہندوستان میں مغل سلطنت جو بابر سے اورنگ زیب تک کم و بیش پونے دو صدی کا زمانہ احاطہ کرتی ہے، فارسی زبان وادب کی ترقی اور اہل علم کی سرپرستی کے لحاظ سے جس دور کو ممتاز اور منفرد حیثیت سے پیش کرتی ہے وہ اکبر کا ۴۹ سالہ عہد ہے جو ہندوستان میں فارسی ادبیات کا ''عہد زرّیں'' کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس عہد میں فارسی ادب اور دیگر علوم وفنون پر جو گراں قدر اور کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے اُسے اکبر ہی کے فطری علمی مذاق اور جود وسخا سے عبارت کرنا زیادہ موزوں و مناسب ہو گا۔ اکبر گرچہ اُمّی تھا مگر قدرتی طور پر اُسے علم وادب اور شعر و سخن سے جو گہری وابستگی تھی وہ اُسے شعر فہمی کے علاوہ شعر گوئی سے بھی باز نہ رکھ سکی۔ ذیل کے اشعار جو تاریخوں میں اُس سے منسوب کئے جاتے ہیں اس کی حسین طبیعت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

دوشینہ بہ کوئی مَی فروشاں
پیمانۂ مَی بہ زر خریدم
اکنوں زخمار سر گرانم
زردادم و دردِ سر خریدم

''کہتا ہے کہ رات مَے فروشوں کی گلی میں جا کر انہیں میں نے پیسے دیئے اور شراب کا پیالہ خریدا۔ شراب جو پی تو مستی اتنی چڑھی کہ سر بھاری ہو گیا اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے پیسے دے کر دردِ سر مول لے لیا۔''

اکبر جو عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا اور جس کی مدت حکومت ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء تقریباً نصف صدی پر مشتمل ہے، علم و ہنر اور سخن پروری کے سبب مغل تاریخ میں سب سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اہل علم و کمال کی قدر دانی، غریب الوطن حکماء اور شعراء کی سرپرستی نے نہ

صرف یہ کہ علم وادب کے نور کو جگمگادیا بلکہ اس کے خیرہ ساز جگمگاہٹ سے پورا ایشیاء روشن اور منور تھا۔ اس زمانے میں دربار اکبری سے منسلک ایسے علماء وفضلاء اور دانشوران موجود تھے جنہوں نے تاریخ، حکمت، فلسفہ، تفسیر، فقہ، نجوم، سیاسیات اور مختلف علوم وفنون پر بیش بہا کتابیں تصنیف کیں اور جن کے دم سے اکبر کی دلچسپیوں اور مساعی کو شرف قبولیت عطا ہوئی۔ ان علماء وفضلاء میں قابل ذکر نام ملا عبدالقادر بدایونی، عبدالرحیم خانخاناں، خواجہ نظام الدین بخشی، ابوالفضل، فیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی اور شیخ مبارک ناگوری کے لئے جاسکتے ہیں، جنہوں نے اپنی گراں قدر تصنیفات مثلاً کتاب الاحادیث، تزک بابری کا ترکی سے فارسی ترجمہ، طبقات اکبری، آئین اکبری، اکبر نامہ، بحر الاسمار، معجم البلدان، سواطع الالہام، موارد الکلم وغیرہ فارسی ادب میں بحر ذخار کی حیثیت سے رکھ چھوڑی ہیں۔ درباری علماء وفضلاء کے علاوہ علم وفضل کے ایسے درخشاں ستارے بھی موجود تھے جنہوں نے دربار اکبری سے غیر متعلق رہ کر اعلیٰ علمی واخلاقی تصنیفات انجام دیں۔ ان مایہ ناز دینی وروحانی ہستیوں میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوریؒ کے اسمائے گرامی اسلامی تاریخ کے زریں باب میں تاقیامت ثبت رہیں گے۔ غرضیکہ اکبر کا زمانہ فارسی علم وادب کی آبیاری اور عروج کا زمانہ تھا اور پروفیسر ایتھے (ETHE) کے شاعرانہ خیال میں اکبر کا عہد علم وادب کی پیش رفت کے ضمن میں "ہندی فصل بہار" سے عبارت ہے۔

یوں تو اکبر کا دربار ایک اچھا خاصا بیت العلم تھا جو علماء، فضلاء، دانشوران، شعراء، حکماء اور دیگر ماہرین علوم وفنون کا مرکز کہلاتا تھا لیکن یہ علمی انجمن، جس نے دفعتاً دربار اکبری کو جگمگادیا اور مغل اعظم کا نام ساری دنیا میں چمکا دیا دو مفخر زماں اور نامور ہستیوں کے تذکرے کے بغیر ضوفشانی کا حق ادا نہیں کرسکتی۔ ان میں ایک نام ابوالفضل اور دوسرا فیضی کا لیا جاسکتا ہے جن پر بادشاہ اور اعیان مملکت کو بجا طور پر فخر تھا۔ ان سطور میں ابوالفضل کے بجائے فیضی کے تعلق سے ہی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

بقول علامہ شبلی نعمانی "فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص ہی پیدا کیے جن کو اہل زبان کو بھی چار وناچار ماننا پڑا ..... خسرو اور فیضی۔" علامہ شبلی نعمانی کے گرانقدر خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد

سلاطین میں امیر خسرو کے علاوہ کوئی ایسا فنکار نہ تھا جس نے خسرو پر سبقت حاصل کی ہو۔ اسی طرح عہدِ مغلیہ میں فیضی کے ہم پلہ کوئی اور نہ تھا جسے وہ شہرت اور مقام دیا گیا ہو جو فیضی کو حاصل تھا۔ یہ فیضی ہی کی شاعرانہ عظمت کا جادو تھا جس نے ایران کے مشہور شاعر علی نقی کمرہ کو فیضی کی مدح میں ۱۳۵ اشعار پر مشتمل ایک طویل قصیدہ اصفہان سے لکھ کر ہندوستان فیضی کی خدمت میں ارسال کرنے پر مجبور کیا۔ قصیدہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں: ع

مرا افگند بر نظم امورم پرتو فیضی
ابو الفیض آن گزین اکبر و شیخ کبیر من
اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی
وگر من مستجیر آستانِ او مجیر من
کیم با او رسد در شاعری دعوای ہمچشمی
کہ در ایں خانقاہم من مرید و اوست پیر من

ایرانی شاعر نے فیضی کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کی شاعرانہ عظمت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا ہے بلکہ اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ شاعری میں فیضی کے مدمقابل کوئی نہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سے اپنی قلبی ارادت کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنا مرشد بھی تسلیم کیا ہے۔

مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی، جو فیضی کے ہمعصر اور دربار اکبری سے منسلک تھے فیضی سے حد درجہ دشمنی رکھنے کے باوجود اُس کے علمی کمالات کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشاء عدیل در روزگار نہ داشت۔"

غرض کہ فیضی دربار اکبری کا سب سے نامور عالم، انشاء پرداز، حکیم، بلند پایہ خطیب و شاعر، عربی، فارسی و سنسکرت زبانوں کا ماہر، تاریخ، فلسفہ اور دینیات کا عظیم ترین اسکالر تھا۔ مگر وہ ان گوناگوں صفات و کمالات کے متحمل ہونے کے باوجود صرف شاعر ہی کی حیثیت سے معروف جہاں تھا، اور اس کے بقیہ اوصاف پر پردے پڑے رہے۔ غالباً اس کو شدت سے

اس بات کا احساس تھا جبھی تو کہتا ہے: ع

امروز نہ شاعرم نہ حکیم
دانندۂ حادث و قدیم

فیضی کا اصل نام شیخ ابوالفضل تھا اور فیضی اور فیاضی اس کے دو تخلص تھے۔ وہ عربی النسل تھا اور اس کے اسلاف یمن کے باشندہ تھے۔ دسویں صدی ہجری میں فیضی کے دادا خضر وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہاں ناگور میں سکونت اختیار کی۔ یہیں انہوں نے ایک عربی خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک تولد ہوئے۔ شیخ مبارک اپنے زمانے کے عظیم المرتبت انسان تھے۔ انہیں علوم ظاہری اور باطنی دونوں پر عبور حاصل تھا۔ چار جلدوں میں تفسیر کبیر کے انداز پر ایک تفسیر لکھی جس کا نام "منبع العیون" رکھا۔ شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور پھر آگرہ آئے۔ جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی۔ خدا نے کثیر العیال بنایا جس میں سب سے اول فیضی تھا۔ ۹۵۴ ہجری میں فیضی کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی اور انتہائی تعلیم اپنے والد بزرگوار شیخ مبارک ناگوری سے حاصل کی اور شاعری میں خواجہ حسین مروی جو دینیات، شاعری، انشاء پردازی، حسن تقریر اور ظرافت و لطیفہ گوئی میں کمال رکھتے تھے، کا تربیت یافتہ تھا۔ عالم شباب میں فیضی اپنے کمالات کے جوہر دکھا رہا تھا اور اپنے شاعرانہ فن کی بدولت بامِ عروج پر پہونچا ہی تھا کہ قسمت نے اُسے گردشِ روزگار کا اسیر بنائے رکھا۔ اس کے ایام مصائب کی سرگذشت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ اس کے پدر بزرگوار شیخ مبارک ناگوری کے عہد میں مہدوی نام کا ایک فرقہ تھا جس پر چاروں طرف سے بندگانِ خدا کی لعنت و پھٹکار اور ذلت و ملامت کی بارش ہو رہی تھی۔ شیخ مبارک جو نہایت خلیق اور پاکیزہ طبیعت کے انسان تھے شیعہ، سنی، مسلمان، کافر غرضیکہ ہر طبقۂ عوام سے ان کی ملاقات اور گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ مہدوی فرقہ سے بھی وہ انسانی اخوت اور اخلاقی تقاضے کے تحت ملا کرتے تھے کہ اس ضمن میں ان کے خلاف عوام میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ شیخ مبارک رافضی ہے۔ بے دین اور ملحد ہے لہذا اسے قتل کیا جائے۔ یہ ۹۷۷ ہجری کا واقعہ اور اکبر کی سلطنت کا چودھواں سال تھا۔ متعصب اور فتنہ پرور قسم کے مولویوں نے شیخ مبارک کے خلاف اکبر کے خوب کان بھرے اور اسے اس قدر بھڑکایا کہ

لامحالہ اکبر کو مبارک کی گرفتاری اور دربار شاہی میں حاضری کا حکم نامہ جاری کرنا پڑا۔ ادھر فیضی کو جب سازشی ٹولہ کی ریشہ دوانیوں کی خبر ہوئی فوراً اس نے اپنے والد کو آگاہ کیا اور راتوں رات کسی پناہ گاہ کی طرف کوچ کر جانے کا مشورہ ہوا۔ چنانچہ شیخ مبارک مع اپنے بیٹوں، بادشاہ اور ارکان دولت کی نظروں سے بچتے بچاتے ادھر اُدھر عرصۂ دراز تک حیران و پریشان سرگرداں رہے۔ انہیں کہیں جائے امان نہ ملی آخر کار جب وہ سب طرف سے پھر پھرا کر آگرہ پہنچے تو یہاں ایک نیک طینت دوست کے گھر قیام کیا۔ وہاں کچھ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد جب لوگوں پر ان کے صحیح عقائد و خیالات منکشف ہوئے تو کچھ لوگ ان کے طرفدار ہو گئے۔ اب کیا تھا بادشاہ تک ان کے عقائد صحیحہ کی خبر گئی۔ کچھ مقربان دربار کی بدولت بادشاہ تک ان کی سفارش کی گئی اور وہ مع اپنے بیٹوں عزت و احترام کے ساتھ دربار شاہی میں شرف حضوری سے نوازے گئے۔ یہی وہ واقعہ ہے جو دراصل دربار اکبری میں فیضی کی رسائی کا سبب بنا۔ یہ اکبر کی حکومت کا ستر ہواں سال تھا۔ فیضی کو اس کے علمی اور شاعرانہ کمالات کی بدولت دربار میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور فیضی بیحد و حساب شاہانہ نوازش و اکرام سے بہرہ یاب ہوا۔ فیضی جس شان سے دربار اکبری میں پہنچا اور جو قدر و منزلت اس کی نگاہوں نے دیکھی ان تمام واقعات کی تصویر اس نے ایک قصیدہ میں بڑے عمدہ اور موثر طریقے سے کھینچی ہے جس کے صرف دو شعر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

فیضی سخن طراز ہے ع

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی
رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی
مبشر ان سعادت ندا کناں کہ بخواں
نجات نامۂ خود ای حزین زندانی

دربار شاہی میں فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہ کی۔ اس کی خوددار طبیعت نے کبھی درباری خدمت گار بننا گوارا نہ کیا۔ طبابت، تصنیف و شعر و شاعری ہی کو وسیلۂ معاش کے طور پر اختیار کیا۔ شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا۔ یہ فیضی ہی کی صحبت اور علمی تربیت کا اثر تھا کہ شہزادہ دانیال ہندی (برج